

PARHLO PAKISTAN

اب آپ ہر قسم کے ناول ہماری ویب سائٹ
سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری ویب سائٹ ناولز راہٹرز کے لئے آفر
بھی دیتی ہے۔ اگر آپ لکھنے کے شائق ہیں تو ہم سے رابطہ
کریں۔ آپ کے ناولز کے علاوہ ناول کے بہترین ہونے
پر آپ کو کیش پرائز بھی دیں گے

ابھی اپنا ناول EMAIL کریں اور اپنے لکھاری ہونے کا فائدہ اٹھائیں۔

WHATSAPP GROUP : 0318-9992829

PARHLO.COM.PK@GMAIL.COM

آیت العزیز شہزاد

کالعصر

دور کی اپنی مانی اور ماموں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مرجی ہے۔ گھر میں دو ماموں، بھائی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عبادان کا بیٹا ہے۔ جو دور کی کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔ بی بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ مانی دور کی کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔ لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آ جاتی ہے۔ پولیس کا نام سن کر بی بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر ایمر علی اپنے جوئیر قاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو ترمیمی اور کشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ قاروق احمد تھوڑا سا ہے۔ عباد، دور کی کو پڑھاتے ہیں شریفہ کو یہ پسند نہیں عباد کے دوست سر عیسیٰ دور کی کو پڑھانے آتے ہیں، دور کی جاتی ہے کہ وہ کہاں امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر بجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوئی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔ شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خود ہے۔ وہ عیسیٰ سے بہت چرتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسیٰ کو بالکلونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

دور کی کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے عیسیٰ سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ بی بی وی آن کر کے دیکھے علائقہ سے متعلق خبر آ رہی ہے۔ چنانچہ کہ علائقہ کی لاش اس کے قلیب سے برآمد ہوئی ہے۔

دور کی پیچھے سے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے متنازع چھوڑنے جاتا ہے، والد کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ رینا عامر سے کہتی ہے کہ عیسیٰ سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروادے۔

سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسیٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

دور کی جلدی سے پیچھے ہٹ کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے جو کہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ فون کر لے وہ فون کر لی دوسری طرف فون اٹھالیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملائی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔

شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دلی ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ قاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائقہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملے ہیں۔

عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کروایا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت ستاتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرنل غائب ہوتا ہے۔

بی بی ذی اپنا پروموشنل ٹریڈ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائقہ خان قتل کیس کے سلسلے میں بی بی ذی سے بات کرتا چاہتا ہے۔ بی بی ذی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔

شاکر کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کہنیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں



بات کا کہتی ہے۔
 درنی ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ درنی حای
 بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے بیٹی آ جاتا ہے۔ درنی ڈر جاتی ہے۔
 عاصم بالی سے مل کر مالا اور بیٹی کی شکایت کرتا ہے۔ بالی اپنی کم عمری کی شادی اور عیصل شوہر کی وجہ سے
 سب سے عار مند تھی۔ درنی بھاکم بھاکم کہتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے
 اجنبی لڑکی کے فون استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔
 نمبر نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت سناتا ہے۔
 سہراب درنی کے پیچھے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے گھر ہوتی ہے کہ بیٹی نے اپنے گھر والوں کو سب بتا دیا ہو۔
 درنی رجاست بات کرتی ہے۔

اٹھائیسویں قسط

ابن سلیمان!
 اے شکوہ و شکایات کے
 نت نئے مضمون باغیچے والے!!
 فریادی کن نکون!!
 تو کہو۔۔۔۔۔
 اپنی قوت گنتار پہ نازاں تمہاری
 زباں آج یوں خاموش کیوں ہے؟
 کیوں نگہ و شاکی نہیں؟
 اور مگر پر سوز کیوں ہے؟
 بدن پر زباں؟
 نوک چراغ کیسی؟
 اور دل مدہوش کیوں ہے؟
 کہو ابن سلیمان؟
 کچھ تو کہو؟
 کچھ تو؟

”بس۔۔۔۔۔“
 زمین کی گردش ستم کی تھی۔ اور آسمان دھواں دھواں تھا۔ بجز سکت و جبل ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر گئے
 تھے۔ کچھ تو ایسا ہوا تھا کہ جو اس کی نیکیوں سے ایک ٹک ”سانے“ دیکھ کر بھی یقین نہیں کر پاتی تھیں۔
 ”بس۔۔۔۔۔ سر۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ مجھے پیچھے؟“ اشکوں کے اتھاہ سمندر سے ابھرنے والے
 ان چند بے ربط سے الفاظ میں نہ جانے کیا کیا کچھ پنہاں تھا۔
 ”بیچان۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تمہیں تب بھی نہیں سکا تھا۔“ اس نے بار بار سوچا تھا کہ اگر وہ کبھی سامنے آئی تو
 اس کے احساسات کیا ہوں گے پر یہ کبھی گمان نہ کیا تھا کہ اسے مقابل پا کر وہ ہر احساس سے ماورا ہو جائے گا۔

بالکل کسی بے روح جسم کی طرح۔۔۔۔۔ سو وہ بے جان سے لہجے میں ایک ایک کر بولا تھا۔
 ”اور آج۔۔۔۔۔ آج۔۔۔۔۔ بھی بس دیکھ ہی رہا ہوں۔“
 ”سر پلیز۔۔۔۔۔“ وہ مضطربانہ دو قدم آگے بڑھ کر اس سے چند قدم فاصلے پر ایستادہ ہوتے ہوئے مگد اگروں
 کے سے لہجے میں بولی۔
 ”صرف ایسے دیکھیں مت۔۔۔۔۔ کچھ بولیں۔۔۔۔۔ کچھ تو کہیں؟“
 ”کیا کہوں؟“ یہ محض دو لفظ نہیں۔۔۔۔۔ وہ اشک تھے جو دل ہی دل میں کہیں رہ کر یوں نمود ہونے کے اسے
 پھر بتا گئے تھے۔
 ”کچھ بھی کہہ لیں۔۔۔۔۔“ وہ بھٹی بھٹی سی آواز میں چلائی۔ ”برا بھلا کہیں۔۔۔۔۔ بد دعا ہی دے دیں۔“
 ”اور میرے یہ سب کرنے سے کیا ہو جائے گا؟“ اس نے بہت عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔
 اتنے عجیب لہجے میں کہ ایک بیک پوری اہمیت و بڑے حوصلے سے ”خولہ“ کا خول اتار بیٹھنے والی ”بدرالودری
 نظیر“ کو اپنی ساری قوت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔ زبان خشک ہو کر تالو سے جا لگی اور حلق میں پھندے سے
 پڑنے لگے۔ اس سے اس متقی خیر سوال کا کوئی بھی جواب نہ بن پڑا تھا۔
 تب ہی وہ چند ٹاپے غبار آلود نگاہوں سے اس کے جواب کا منتظر رہنے کے بعد معا ایک جھٹکے سے اٹھا اور
 فوراً سے پیش کتب خانہ عبور کر گیا۔ اور اسے روکنے کی خواہش میں درنی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اور
 اب پورے کتب خانے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

”کہہ رہی ہے کہ بچوں کے پڑھنے کی کوئی جگہ نہیں، اس لیے اس کمرے کو اسٹڈی روم بنارہے ہیں۔“
 اسے اس پر شور مچانے کے ڈھابے سے اٹھ کر گھر جانے کی ذرا بھی جلدی نہ تھی۔ سو بڑے اطمینان
 سے خوشبودار چائے کے گھونٹ بھر تار رہا اور اس کا ذہن۔۔۔۔۔ وہ کسی پروجیکٹر کی طرح کبھی تو بھی کہیں
 روشنی کی ایک مہین کی چادر پھیلا کر اس پر کیے بعد و گھرے کئی مناظر اسے دکھانے کا اہتمام بڑی مستعدی
 سے کرتا چلا جا رہا تھا۔ اور فی الوقت یہ منظر اس کے سامنے کبھی لکڑی کی معمولی سی سال خوردہ میز کی سطح پر
 روشن تھا کہ جس میں شونا، بالی، لٹی اور شانی فیروزہ کے کمرے میں براجمان آپس میں مگو گفتگو تھیں۔ جب کہ
 وہ خود۔۔۔۔۔ وہ صوفی صاحب کے مشورے پر چالیس دن اللہ کی راہ میں لگا کر لوٹا تھا۔ ماں سے دائمی جدائی کا
 غم اپنی جگہ پر اب وہ کسی حد تک سنبھل چکا تھا۔ سو روزمرہ کے معاملات میں دل چسپی لینے لگا۔ اور ابھی وہ
 بہت دن بعد گھر میں اکٹھی ہونے والی بہنوں سے ملاقات کی غرض سے فیروزہ کے کمرے میں داخل ہوا تھا
 تب ہی اس نے شونا کو کہتے سنا۔
 ”ہے۔۔۔۔۔“ بالی نے یہ سن کر لیوں پر چار انگلیاں رکھتے ہوئے جیسے حیرت آمیز ناگواری کا اظہار کیا۔
 ”اتنا کمرہ اور بھی تو ہے نے گھر میں۔۔۔۔۔ اس کا بیچھا کیوں لے لی ہیں وہ؟“
 ”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔۔۔“ نفی اپنی اب تک کی زندگی میں غالباً پہلی بار بالی سے مکمل اتفاق کرتے
 ہوئے بولی۔
 ”کمرہ تو شا کر بھائی جان کا بھی ہے، اسے اسٹڈی روم بنالیں۔“
 ”اسے تو اس نے گیسٹ روم بنالیا ہے۔“ شونا نے ذرا تپا پندیدگی سے کہا۔ ”اس کے میکے والے آئے دن
 آ کر وہیں تو رکتے ہیں۔“
 ”اور چھوٹا کمرہ؟“ شانی نے پتا نہیں یاد رہانی کروائی تھی کہ ایک کمرہ وہ بھی تو ہے یا اللہ جانے سوال پوچھا

تھا۔ جس پر اس بارگاہی ترنت بولی۔
 ”وہ تو انہوں نے اپنے بیٹے کو دے دیا ہے۔“
 ”کیا ہوا؟“ اس نے بہنوں کے چہرے سے سرخ ناگواری آمیز نظر دیکھ کر استفسار کیا، وہ ان کے مابین جاری گفت گو سے ناواقف تھا۔

جب بالی نے اپنے مخصوص انداز سے رندمی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔
 ”ریتا اس کمرے کو پڑھائی کا کمرہ بنانے والی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ بابو..... ہم کیا کریں؟“
 ”کیا کریں گا کیا مطلب؟“ وہ تو یہ سنتے ہی ہنسنے سے اکڑ گیا۔ ”صاف صاف منع کریں انہیں اور کیا کریں گے۔“
 ”نہ بابا..... وہ بد کی..... ہم کا بے لینے لگے اس چوٹے (عامر) سے پنگا..... ابھی تو ہمیں ایہاں (یہاں) عزت سے بٹھا رہا ہے۔ کھارہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خفا ہو کر ہم پر کمر کا دروازہ ہی شیخ مارے (بندر کر دے)۔“
 ”کیوں ہو گا ایسا؟“ وہ بولا۔ ”آخر یہ گھر آپ سب کا بھی تو ہے۔“
 ”مگر تو ہمارا وہی ہے جہاں اب ہم رہتے ہیں۔“ شونا گھبرتا سے بولیں۔ ”پھر کیا فائدہ یہاں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا۔“

”مجھے تو ویسے بھی انہوں نے منع کر رکھا ہے کسی کے بیچ میں بولنے سے۔“
 شانی حفظہ مقدم کے طور پر پہلے ہی بول اٹھی۔
 تب اس نے بہت متاسف نگاہوں سے اسے دیکھنے کے بعد نفی کی جانب نگاہ کی۔
 ”دیکھو بیٹی، وہ غالباً اس کی نگاہوں کا منہ پر سمجھ چکی تھی تب ہی خاصی متنبہ کر مصلحت سے بولی۔ ”ہاں ٹھیک ہے کہ ہم سب ہی ان کے اس ارادے پر دم تھیں، انفر وہ ہیں مگر یہ بھی ہے کہ اعتراض کرنے کی صورت میں بد مزگی کا اندیشہ ہے سو میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی کہ جانے دو۔“
 ”اچھا تو جانی چکیں۔“
 وہ ان مصلحت پسندوں کی مصالحت دیکھ کر حیران زیادہ ہوا تھا یا مغموم..... وہ خود نہیں جانتا..... مگر ایک بات سے واقف تھا کہ وہ یہ سب ہوتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا..... سو بڑے واضح کاف الفاظ میں بولا تھا۔
 ”اب ان کا کمرہ بھی یوں ہی جانے دوں..... نہیں..... یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔“
 ☆☆☆

”آپ کسے ہیں عباد بھائی؟“
 وہ رات گئے گوش عافیت میں جتنے والی خوش گوار غافل خواب و خیال بن کر رہ گئی تھیں، ایک ایسا خواب جو وہاں کے کین جانگی آنکھوں سے اب بھی دیکھا کرتے تھے اور خیال جو ان کے اذبان سے بھی ٹھوکتا ہی نہ تھا..... اور ابھی ایسے ہی کسی خیال کے زیر اثر اب ہمہ وقت بخندہ رہنے والا مفتاح لڈو کی بساط بچھا کر بیٹھ تو گیا تھا مگر کسی اور کو بکا کرنے کی خواہش اس کے دل میں یوں نہ جاگی کہ سامنے بچے اس مریخ نما گتے میں اسے ماسوائے سیاہ کے، کوئی اور رنگ دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔

سو وہ چند ساعت اسے یوں ہی بے تاثر نگاہوں سے دیکھ گیا، بعد ازاں بس ایک دم ہی بہت بے دلی سے اسے لپٹ کر ایک طرف کر دیا اور ابھی وہ لاؤنج سے اٹھ کر میز کی جانب بڑھا ہی تھا کہ مجا سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا فون بج اٹھا..... اس نے اٹھا کر دیکھا..... عباد کا نمبر تھا۔
 عباد نے آج بڑے دنوں بعد خود اسے یاد کیا تھا۔ سو وہ اس امر کو خوش گوار تصور کر کے اپنی ساری یاسیت

ایک جانب کرتے ہوئے قدرے بٹاش سے لہجے میں بولا۔
 ”جی رہا ہوں!“ دوسری جانب سے ان کی ٹخف و حد درجہ بخندہ کی آواز سنائی دی تھی۔ سو مفتاح کی ساری بٹاشت آن واحد میں منہ چھپا کر کسی نامعلوم سمت نکل گئی۔ اور وہ خود چپ کا چپ رہ گیا۔
 ”بتاؤ مفتاح..... اس کی خاموشی پر بڑے چین سا ہو کر عباد نے استفسار کیا۔ ”کوئی سراغ مل سکا اس کا؟“
 مفتاح کی تو خواہش تھی کہ خود ساختہ جلا وطنی کا نئے اس کے ماں جائے کو اس قیامت خیز واقعہ کی خبر نہ پہنچے مگر اب کیسے ممکن تھا؟

سو شریفہ نے اسے خود فون کر کے ورٹی کار شہ طے ہو جانے سے نلے کر ایک ایک بات نہ صرف ٹھک، مریخ بلکہ پورا گرم سالہ لگا کر بتاتے ہوئے اس حرافے سے اپنے معصوم لخت جگر کو بچانے کا سہرا بھی خود اپنے ہی پر باندھ لیا تھا۔ اور یہ سن کر ان کے معصوم لخت جگر پر کیا گزری؟ ظاہر ہے کہ یہ جاننے سے انہیں دل و جگر بھی نہ ہی ان کے پاس فرصت کہ ابھی تو ہتیرے کرنے والے اہم کام ان کی راہ تک رہے تھے۔ سو وہ تو یہ بھی محسوس نہ کر سکیں کہ اس کے بعد عباد نے پاکستان کال کرنا مکمل طور پر ترک کر دی تھی۔ یہ تو مفتاح تھا کہ جسے نہ صرف ان کے ”اجاز“ دے جانے والے دل کا بھر پورا احساس تھا بلکہ وہ ان کے گوش عافیت سے رابطہ نہ کرنے کو ان کا صاف صاف احتجاج گردان رہا تھا سو اس نے از خود انہیں فون کر کے ان کی روزانہ کی بنیاد پر خبر گیری کو اپنا فرض تصور کر لیا تھا۔

پہلے پہل تو رابطہ قائم ہونے پر وہ یوں خاموش رہتے گویا ان کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو اور یہی حقیقت تھی کہ اب کہنے سننے کو واقعی ان کے پاس رہ ہی گیا تھا۔ مگر ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ واقعہ خواہ کتنا بھی دل خراش کیوں نہ ہو حضرت انسان بہر حال نارمل ہوتی جاتا ہے۔ سو وہ بھی شاید ہوتی گئے تھے یا غالباً نہیں۔ کہ تب ہی تو سردست ایک ایسا دقیق سوال مفتاح سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔
 ”آں..... اب تک تو نہیں۔“ وہ جواب لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔ ”مگر امید ہے کہ وہ جلد مل جائے۔“
 ”نہیں مفتاح.....“ وہ اس کے لہجے سے اس کا اصل جواب جان گئے تھے سو مغموم سے انداز سے اس کی بات درمیان ہی سے قطع کرتے ہوئے بولے۔ ”مجھے اب کوئی امید نہیں۔“
 اور سچائی بہر حال یہی تھی کہ وہ خود بھی تقریباً مایوس ہو چکا تھا مگر ان کے سامنے اس اظہار کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

”کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو گئے؟“ وہ غالباً یہ چاہتے تھے کہ مفتاح ان کی بات رد کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرے کہ وہ غلط سوچ رہے ہیں مگر.....

”آپ واپس کب آرہے ہیں؟“ مفتاح نے موضوع بدلتے ہوئے گھبرتا سے پوچھا۔
 ”پتا نہیں۔“ وہ اچانک سے لہجے میں بولے۔ ”اور پھر واپس آ کر کرنا بھی کیا ہے؟“
 ”آپ کا تو نہیں پتا کہ کیا کرنا ہے۔“ مفتاح پریش سے لہجے میں بولا۔ ”مگر مام کا بتا دوں..... وہ کل فرنی باجی سے آپ کے رشتے کی بات کرنے جا رہی ہیں۔“

”کیا انہیں اب بھی احساس نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیا کر چکی ہیں؟“ انہیں یہ جان کر حقیقتاً چھکا لگا تھا تب ہی بے ساختہ غم زدہ سے لہجے میں بولے۔

”یہی تو افسوس ہے بھائی۔“ مفتاح فون کان سے لگائے لگائے اب میز پر آ نکلا تھا۔ اور اس کی ٹیش میں ڈوبی آواز سنائے میں دور تک جاتی تھی۔ ”اور ج کبوں تو مجھے لگتا ہے کہ جسے یہ احساس و حساس ان کے اندر ہے ہی نہیں۔ ان میں صرف اتنا ہے۔ ضد بے پناہ جھنڈ۔ اور یہی سب مل کر انہیں یقین دل رہے ہیں کہ جو وہ چاہتی

”ایسا کہ جیسے میں انکڑوں پر لپٹی ہوئی ہوں۔“ وہ نورنگا ہوں سے غلامی منتی ہوئی مجھ پر لپٹی ہوئی ہوں۔“
 ”اور آسان تک بلند ہوتے سرخ آگ کے شعلے مجھے لگنے کو میری جانب مسلسل لپک رہے ہیں۔“
 ”توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔“ جلی بھی سی رضیہ، جو اس کی بیماری کے باعث دہرے تہرے کام نشتانے پر مجبور تھی اور
 اسی وقت بی بی ذی کا ناشتا ٹرے میں سجائے کمرے میں لاد رہی تھی۔ درمی کالی ذی کو دیا جائے والا جواب سن کر بے
 ساختہ جھلپائی ہوئی بولی۔

”ایسی ذرا سے بازی کی باتیں۔۔۔ میں بتا رہی ہوں آپ کو میڈم جی۔۔۔ یہ کوئی بیمار ویار نہیں۔۔۔ کس کام
 سے بچنے کے لیے ہانک کر رہی ہے۔“

”بی بی ذی کے لیے بستر پر ہی میزبٹ کرتے ہوئے مسلسل اس کے خلاف بولے چلی جا رہی تھی۔ تب ہی
 بی بی ذی نے ناگوار سے ایک دم اسے ٹوک دیا۔

”اوہ پوٹ آپ پلیز۔۔۔“ پھر اسے طبیعتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”یہ کام چور نہیں۔۔۔ بلکہ اپنی
 ساری ذہنی تربیت اچھی طرح سے سرانجام دینے والی لڑکی ہے۔ یہ پچھلے ایک سال سے میری میلمن ہے اور اس
 نے اپنے اس کام میں ایک بار بھی کوتاہی نہیں کی۔۔۔ آج مجھ میں جتنی بھی امپرورمنٹ ہے، اس کا کریڈٹ کچھ نہ
 کچھ اسے ہی جانا ہے سو پلیز، تم اس کے بارے میں ایسی بات مت کرو اور جاؤ، اس کے لیے چائے کے ساتھ

کچھ کھانے کو لے آؤ۔ اس کی میڈن کا نام ہو گیا ہے۔“

”جی میڈم۔۔۔“ رضیہ کو بی بی ذی کی ”خولہ“ کے لیے اس صبح سرائی نے جی جی میں چراغ پا کر دیا تھا
 تاہم بظاہر وہ تاح داری سے بولی۔

”ابھی لے کر آئی ہوں۔“ وہ بی بی ذی کا ناشتا میز پر رکھ چکی تھی، سو کہہ کر مڑی اور حال سے بے حال پڑی
 درمی پر ایک جھلپتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

(ایک تو میرا اتنا ”چھوٹا سا کام بھی نہیں کیا اور پر سے میڈم صاحبہ کی نظر میں ہیروئن بھی بن گئی۔ تاہم
 کر کے جتنا آرام کرنا ہے کر لے۔۔۔ تجھے مزہ تو اب میں چکھاؤں گی)

وہ دل ہی دل میں پکا ارادہ کرتے ہوئے کمرہ عبور کر گئی۔ اور درمی۔۔۔ وہ ایک بار پھر غنڈگی میں جا چکی
 تھی۔

”یہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ بی بی ذی اسے ہاتھ پر چھوڑے دیکھ کر تشویش زدہ سی سوچنے لگی۔
 ”اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔“

☆☆☆

”اے ہے تو پھر کیا ہوا؟“

وہ چائے شہم ہونے کے بعد بھی تادیب دیتی، اس ڈھابے بیٹھا رہا۔۔۔ مگر کب تک؟ سو آخر کار پیسے
 دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اور بہت آہستہ روی سے چل آگے بڑھنے لگا۔ مگر شام بھی کی ڈھل کر سیاہ
 ہو چکی تھی۔ دھرتی نے آج اپنا ایک اور ستر مل کر لیا تھا اور ایک وہ تھا کہ جو تاحال راستوں ہی میں بھٹک
 رہا تھا۔ ماضی بعید کے پرچہ راستوں میں۔۔۔ اور جسے وہ ”حال“ کہاں کر رہا تھا۔ غن قریب ان مناظر نے
 بھی ماضی ہی بن جانا تھا۔ پر اسی وقت تو اس کے قدم سامنے کی سمت اٹھ رہے تھے اور اس کے تعاقب میں
 تھا ایک اور ایسا منظر کہ جو اس نے تو بھی نہیں دیکھا۔ ہاں مگر اس گھر کے درو دیوار نے ہو کر جو اس کا ہوتے
 ہوئے بھی اب اس کا نہیں رہا تھا۔

اس نے فیروزہ کے کمرے کو اسٹڈی روم بننے نہیں دیا اور نہ اپنا کمرہ چھوڑنے ہی پر آمادہ ہوا سو بٹ دھری

سے عامر نے شاکر کے کمرے کو اسٹڈی بنانے والی پیش کش بھی رد کر دی۔ اور نیز اس کمرے کو اسٹڈی بنا کر کرنا
 بھی کیا تھا کہ جیسے پہلے ”کیسٹ روم“ کا درجہ دیا جا چکا۔ اور یہ درجہ اسے ایسے ہی محض نام رکھنے کو نہیں دے
 دیا گیا تھا بلکہ اسے بڑے بھرپور طریقے سے تصرف میں لیا جا رہا تھا کہ وہاں آئے دن رہنے کے گھر سے وارد
 ہونے والا کوئی نہ کوئی ”مہمان“ بڑے حُرے سے ٹھہرا ہوتا تھا۔ بھی کوئی ہمشیرہ تو بھی بھانجی، بھی کوئی تو بھی
 کوئی۔۔۔

اور آج تو خیر رینا کی سال گرہ تھی سو وہ والدہ باجود سمیت ساری ہی ادھر رونق افروز تھیں۔ ملاؤ، سبخ
 کباب اور چنے کی دعوت اڑائی جا چکی تھی۔ ہما کے شاہ خرچ سر تاج کے توسط سے ایک، بطور خاص گلشن
 کی ایک معروف بیکری سے منگوایا تھا۔ جسے تاحال کا کاناویوں نہ جاسکا کہ صاعقہ کا انتظار تھا جو کسی بہت ہی
 خاص وجہ سے اب تک یہاں نہیں پہنچ سکی تھی مگر اپنے 3210 سے انہیں لینڈ لائن پر کال کر کے جلد پہنچنے کا
 مژدہ ضرور سنا چکی تھی۔ سو وہ ساری ہی لاؤنج میں ادھر ادھر لپکی ہوئی، کچھ تو وقت گزاری کی غرض سے اور
 کچھ عادتاً لوگوں کو اپنی نیکیاں اندھا دند بانٹنے میں مصروف تھیں۔ سو رینا نے بھی کہ جس کا دل واقعتاً سلگ
 ہوا تھا، لگے ہاتھ اپنا تازہ ترین وکٹر انہیں سنا شروع کر دیا۔ بلا تھکان بولتی رہنے نے ذرا دم لینے کو ہاتھ میں
 موجود سوپ ڈرنک کا گھونٹ بھر اور بس اتنی ہی دیر اسے بغور سختی بخم کو بہت گراں گزاری گی سو اس نے
 بڑی بے قراری سے استفسار کیا۔

”ہونا کیا ہے؟“ رینا لب کشا ہوئی، اس سے قبل ہما تسخیرے ہنس کر بہت دھوک سے بولی۔ ”اس کے
 میاں کو بات ماننا پڑی ہوگی اس سر بھرے گی۔

”ہاں سہوے!“ خمر نے بے ساختہ افسوس بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا واقعی؟“ تب رینا کا چہرہ امانت
 سے سرخ پڑ گیا اور وہ سکتے لہجے میں بولی۔

”ہاں۔۔۔ ہوا ابھی پہنچی ہے مگر جلد میں اسے یہاں سے نکلوا دوں گی۔ کیونکہ اب یہ گھر صرف اور صرف میرا
 اور میرے بچوں کا ہے۔“

اور جس سے وہ اس عزم کا اعادہ اپنی بہنوں کے سامنے کر رہی تھی اس وقت بھی ایسی جیسے دنیا و دنیا سے
 غافل صوفی صاحب کی مجلس میں براجمان تھا۔ اور اس کا یہ غیر متوازن رویہ خود اس کے لیے کس قدر تباہ کن ثابت
 ہونے والا تھا، اس سچائی کا اسے ادراک ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

”میرے بچے میرے لعل کیسا ہے تو؟“

”اس وقت تو کیا، اگلے دو دن سب ہی کے فون کرنے کے باوجود عباد نے کسی کی بھی کال وصول نہیں کی تھی
 بس ”مصروف ہوں۔“ کا پیغام بھیج دیا تھا۔ بہر کیف دو چار روز بعد وہ سب جب رات کا کھانا تناول کر چکے تب
 ایک بار پھر شریف نے عباد کو کال ملانے کا کہا۔۔۔ اور اس بار واطلہ نے ان کے گھر سے نہیں بلکہ شریف احمد کے
 فون سے عباد کو کال ملانی بھی جوا نہوں نے دو چار منٹ کے بعد اٹھائی۔ اور واطلہ کے ہیلو کرتے ہی شریف نے لپک
 کر اس سے فون چھین لیا۔ اور پھونٹتے ہی اپنے لہجے میں زمانے بھر کا دلار بھر کر ان سے پوچھا تھا۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ شریف احمد کے گھر سے شریف کی آواز سن کر چونکے تاہم کھیل کر خشک سے لہجے
 میں جواب بولے تھے۔

”اتنی یاد آ رہی ہے تیری، تو کب آئے گا پاکستان؟“

رجا باب واطلہ کے ساتھ مل کر میز سمیت رہی تھی جب کہ عارفہ چائے، قہوہ وغیرہ تیار کرنے کی غرض سے

بادرہی خانے کا رخ کر چکی تھیں۔ عارف احمد ڈی وی لگا کر بیٹھ گئے تھے جب کہ شریف احمد کی کے بلوں کی فائل لیے صوفے پر بیٹھے تھے اور خدا جانے کیا حساب کتاب کر رہے تھے۔ مہر تو خیر سب سے پہلے میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکا تھا اور ہر مہینہ ان سب کے ساتھ نہ ناشتہ ہی کیا کرتا تھا نہ عشاء۔ سو وہ بس ابھی ابھی ہی کھسکے واپس آیا تھا اور کمر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے شریفہ کی شیرے میں لتھڑی آواز گھرائی۔

”ابھی تو بہت مشکل ہے۔“ انہوں نے دوسری جانب سے خامے کمر درے لہجے میں کہا تھا۔ شریفہ دہائی دیے لگیں۔

”ارے تو پھر لذت بھیج ایسی نوکری پر اور فوراً آ جا یہاں..... میں تو ترس گئی تیری صورت دیکھنے کو.....“

”ترسا تو میں بھی بہت تھا۔“ وہ کہہ کچھ اور ہے تھے پر شریفہ ”کچھ اور“ سمجھ کر انہیں پکارتے لگیں۔

”ارے بچے تو کس نے کہا ہے ترسے کو، آ جانا یہاں اور پھر اب تو یوں بھی تجھے آنا ہی پڑے گا۔“

”کیوں؟“ وہ چونکے۔ ”کیوں آنا پڑے گا؟“

”میں نے تیری بات جو فرضی سے پکی کر دی ہے میرے بچے۔“ وہ خوشی سے سرشار لہجے میں انہیں مطلع کرتے ہوئے بولیں۔

”ہوں۔“ وہ یہ خوش خبری سماعت کرنے کے بعد یک لمحہ توقف کے بعد معنی خیز ہنکارا بھرتے ہوئے بولے۔

”اور بات پکی کرنے سے پہلے آپ نے میری رائے لیتا تو درکنار، آپ نے مجھے آگاہ کرنا تک ضروری نہیں سمجھا.....؟“

”آگاہ ہی تو کر رہی ہوں۔“ وہ اپنے زعم میں تھیں، سوان کے لہجے کا غیر معمولی پن محسوس کیے بنا چپکتے ہوئے بولیں۔

”یعنی آپ کی نظر میں گویا ایسی ہی بے جان شے ہوں میں؟“

”بے جان شے کی کیا بات ہے۔“ وہ خفا سے لہجے میں بولیں۔ ”میں ماں ہوں تیری، اتنا تو مان ہے تجھ پر کہ جانتی ہوں تو مجھے انکار نہیں کر سکتا۔“

”سینے!“ ابھی شریفہ اس صحن میں اور بھی بہت کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں کہ دوسری جانب سے سنائی دینے والی ایک لوج دار، مترنم آواز نے انہیں بے طرح ٹھٹھک کر خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔

”کھانا ختم ہو جائے گا۔“ وہ جو کوئی بھی یقیناً عباد سے خطاب ہو کر کہہ رہی تھی۔ ”پہلے کھا لیجیے، بات بعد میں کر لیجیے گا۔“

”یہ..... یہ..... یہ۔“ شریفہ بوکھلاہٹ زدہ لہجے میں کہتے ہوئے ایک دم چوک سی تھیں۔ ”یہ کس کی آواز ہے؟“

”میری بیوی کی!“

جواباً عباد نے توقف ہی کیا اور نہ ہی ہچکچائے۔ بلکہ پورے سکون اور اعتماد سے شریفہ کی سماعت پر اطمینان سے بار بار تھا۔

”یہ..... یہ..... یہ۔“ شریفہ کو چکراتے لگے۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔“

”وہی جو آپ نے سنا۔“ وہ بہت اطمینان بھرے لہجے میں بولے۔

”میں یہاں شادی کر چکا ہوں۔“

”نہیں.....“ شریفہ کا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”بالکل ہو سکتا ہے مام۔“ وہ اس بار فیسے تھے۔ بے رحمی تھی۔

”نہیں کہ آپ اگر میری ماں ہیں ناں، میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں۔“

☆☆☆

”عاشق بنایا، عاشق بنایا آپ نے۔“

وہ نہ جانے کب سے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے یونہی بے مقصد سڑکوں کی خاک اٹھانے چلا جا رہا تھا اور حقیقت یہ بھی کہاں وہ اس بے سمت مسافت سے ٹھک چکا تھا، گھر جانا چاہتا تھا مگر ”گھر؟“

جوڑائی چند سال قبل وہاں شروع ہوئی تھی، اس نے اسے گھر کہاں رہنے دیا تھا۔ وہ تو ”میدان جنگ“ تھا جہاں ہر وقت جو کنارہ رہنے کی ضرورت یوں تھی کہ کسی بھی سمت سے وار کا خدشہ تھا۔ سو وہ غدا حال سا ہو کر یونہی فٹ ہاتھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا تھا اگر جو وہ بھی دیگر کی طرح عام اور ریتا کے معاملے میں منافقانہ رویہ اختیار کر لیتا؟

مگر نہیں، منافق تو بزدل ہوتے ہیں اور وہ حق پر ہوتے ہوئے بزدلی کا مظاہرہ کیسے کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں کر سکتا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے کہ حق بجانب ہوتے ہوئے مصلحتاً اختیار کی گئی خاموشی باطل کو شہ دینے کے مترادف ہے۔ اور وہ کسی طور اپنے نام کا اندراج باطل کی طاقت کو بڑھاوا دینے کا سبب بننے والوں کی فہرست میں نہیں کرانا چاہتا تھا سو ہمیشہ اس نے وہی کیا کہ جو کرنا چاہیے تھا۔ اسی روز کہ جس دن وہ اپنی غیرت ”ڈراسی“ کم کر کے خود کو ہزار ہا دشواریوں سے بچا سکتا تھا مگر وہ ان دنوں گھر سے باہر زیادہ تر مسجد میں صوفی صاحب کی سنگت میں وقت گزارا کرتا تھا۔ کمرے والے واقعے کے سبب اس کا دل جیسے سب ہی سے مزید اچاٹ اور دور ہو گیا تھا۔

اسی مطلب پرست و مصالحت پسند دنیا میں وہ مسجد ہی اس کی ”جائے پناہ“ تھی۔ سو وہ زیادہ تر وہیں رہا کرتا اور شب ب سری کے لیے واپس گھر لوٹتا تھا مگر اس دن صوفی صاحب کی سفر پر روانہ ہو رہے تھے اور خود اس کی طبیعت بھی کچھ ناساز تھی سو وہ سہ پہر ہی کو گھر لوٹ آیا۔

یوں تو گھر والے اپنے اپنے کمروں میں تھے مگر اونچی آواز میں بیچے ڈیک نے ایک ہنگامہ سا چار کھا تھا۔ یہ کون تھا جو اتنی اونچی آواز میں اس وقت گانے سن رہا تھا؟ اسے تعجب ہوا اور آواز کی صورت سر پر برستے ہتھوڑوں سے پریشانی بھی۔ تب ہی وہ والیوم ذرا کم کرنے کی درخواست کرنے کی غرض سے آواز کے منبع کی جانب بڑھا۔

آواز ”گیٹ روم“ سے آرہی تھی!

سو وہ دو چار قدم چل کر دروازے کے نزدیک پہنچا اور اسی بل ایک تہی کو سٹپلانے پر مجبور کرتی ناگوار سی بو اس کے کتھنوں سے گھرائی۔

”آخر یہ اندر کون ہے؟ اور کون کیا رہا ہے؟“ اس نے تشویش و تباہی کی ملی جلی سی کیفیت کے زیر اثر دو چار مرتبہ دروازے پر دھیرے سے دستک دی۔ جیسے غالباً سنا ہی نہ جا سکا یا پھر کیف و سرور کے ریلے میں بہتے دانستہ نظر انداز کر دیا گیا، کیا معلوم؟ پر جو بھی تھا۔ چونکی دستک کے بعد عین نے اپنی چھٹی حس کے حسیل اشاروں کو سمجھتے ہوئے دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھا اور..... دوسرے ہی بل چوس و ام انجائٹ کے نشے میں ڈولتا ایک حسینہ کے ساتھ مصروف سہرا ب نگاہ کے سامنے تھا۔

”بے غیرت“ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اپنے گھر کے خندس کی اس درجہ پامالی دیکھ کر سواں نے ہر

مصلحت بالائے طلاق رکھتے ہوئے جھٹ سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور تار تار نوڈ نکالوں سے اس کی توضیح کرتے ہوئے اسے کمرے سے باہر گھسیٹ لایا۔
 ”میرے والد نے اس لیے بنایا تھا یہ گھر کہ تیرے جیسے خبیث یہاں آ کر عیاشیاں کریں۔“
 ”ہائے اللہ۔“ شور شراب اس کمرے کی ریختا اپنے کمرے سے اقبال و خیراں برآمد ہوئی۔ ”کیا ہوا؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟“
 ”پوچھیں اپنے بے حیا بھانجے سے۔“ اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور چہرہ اس قدر لہو رنگ تھا کہ دیکھ ہی نہ سکتی۔
 ”یہ کیا کر رہا تھا اور آخر آپ کیا پوچھیں گی؟“ وہ اچانک چونک کر بولا۔ ”آپ تو یقیناً سب جانتی ہی ہوں گی مگر نہ یہ کہ کیوں یہاں تک کیسے لے کر آ سکتا تھا؟“
 ”کیونہی؟“ میری بات سنو۔“ یقیناً مجھنی تھی تو وہ بہت بری تھی سو جلدی سے جوڑ توڑ کرنے کے بعد اسے پکارتے لہجے میں بولی۔
 ”کچھ نہیں سننا مجھے۔“ وہ بھڑکا۔ ”آج کے بعد اگر یہ اس گھر میں نظر آیا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

ذکر تھا اور مگرین کارڈ کے حصول کے لیے وہیں شادی کرنے کی اطلاع بھی۔ وہی دن تھے کہ جب عباد اس کے دفتر میں نیا نیا تعینات ہوا تھا۔ دل اور چندار کا ٹوٹ کر پاش پاش ہو جانا اپنی جگہ مگر وہ اپنی روزی کولت نہیں مار سکتی تھی سو دفتر میں اپنے نئی حالات کے سبب غلطیوں پر غلطیاں کرتی رہی۔ اور یقیناً وہ بھی اپنے نئی حالات ہی کے باعث دیگر افسران کے برعکس اسے رعایت پر رعایت دیے گئے۔ وہ وقت اس کے لیے گڑا تھا جو عباد کی مہربانی کے باعث نسبتاً آسانی سے گزر گیا۔

وہ ان کی احسان مند تھی۔ ان کے مابین روزانہ کے ساتھ کے سبب ایک دوستانہ فضا کے علاوہ احترام کا رشتہ بھی قائم ہو چکا تھا۔

اور ان دنوں درنی کے اس بھری دنیا میں کہیں ”گم“ ہو جانے کی خبر انہیں ملی اور اس خبر نے انہیں اس بری طرح توڑا تھا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ دنوں آفس سے غیر حاضر رہے۔ نوکری کا برقرار دینا نہ رہتا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا سو دفتر اطلاع بھی نہ کی۔ تب ایک روز میونسپل کمران کے چھوٹے سے قلیق پر چلی آئی۔ اور تب جا کر اسے صورت حال کا علم ہوا۔ قصہ مختصر اسے احسان چکانے کا اچھا موقع ملا تھا۔ سو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے لگی مگر اس کے باوجود اس سے ”آگے“ اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ ذہن گیا ہی نہیں اور پھر ایک روز بہت اچانک بالکل ہی غیر متوقع طور پر عباد نے اس سے سوال پوچھا تھا۔

”کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“

تب وہ ہکا بکا رہ گئی۔ حیرت و تعجب جب کم ہوا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ مگر خود آگاہ تھی سوپس وچیش سے کام لیا۔ مگر عباد نے تو جیسے صدی پکڑ لی تھی۔ سو کئی مراحل کے بعد بالآخر وہ ان کے نکاح میں تھی۔

اور آج وہ اس کے بارے میں شریفہ کو آگاہ کر چکے تھے۔

”جی!“ عباد جو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے اس کی لوج دار آواز پر سر اٹھا کر اس کا منہ چہرہ دیکھا۔

”بتا دیا!“

”کچھ نہیں دیکھی تھی؟“ اس کی چمک دار آنکھوں سے روایتی خوف مٹ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ اٹھے اور بہت محنت سے اس کا دایاں گال تھپتھا کر بولے۔

”وہ کچھ بھی نہیں، اب آپ میری بیوی ہیں۔ سو ہر خدشہ دل سے نکال دیں۔“

☆☆☆

”یہ کیا سن رہا ہوں میں؟ تم نے جس پیمانہ شروع کر دی ہے؟“

اس کا سنس تیز ہو گیا تھا، سو وہ یک دم ہی فٹ پاتھ سے اٹھا اور خالی رفتار سے چل دیا۔ اور اس بار اس کا رخ پورے اعتماد سے گھر ہی کی جانب تھا کہ اسے ابھی ہی ادراک ہوا تھا کہ وہ اس جنگ کو یوں ہی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ چھوڑ دینے کا مطلب ہر اس الزام کا اقرار تھا کہ جو آج تک اس پر لگائے جاتے رہے تھے۔ قصور وار بلکہ گناہ گار بھانجا تھا، مگر یہ انے اسے بالفاظ دیگر خود کو بچانے کے لیے اس خوبی سے کہانی گھڑی کہ ہمیشہ کی طرح اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا اور یوں اس وقت شاکر جو عموماً بہت حلاوت اور شائستگی سے بہت محتاط الفاظ میں گفتگو کیا کرتے تھے محاورہ نہیں بلکہ حقیقت اس پر گرج رہے تھے۔

”میں نے؟“ وہ یوں کر ششدر رہ گیا۔ ”یہ کس نے بتایا آپ کو؟“

”عامر ہی نے بہت پریشانی سے بتایا ہے۔“ وہ بڑبڑا کر بولے۔ ”اور کون بتائے گا؟ والدین کے گزر جانے کا

یہ مطلب نہیں کہ تم جو چاہے وہ روش اختیار کر لو۔“

”آپ میری وضاحت سنیں گے یا فیصلہ کر چکے ہیں؟“ اس نے ان کے الفاظ پر بے تاثر لہجے میں پوچھا تو وہ سخت خفا ہو گئے۔

”بڑے بھائی سے بدتمیزی کرو گے؟“

”بدتمیزی نہیں، صرف سوال کر رہا ہوں کہ کیا معافی کی گنجائش ہے یا آپ مجھ پر لگائے گئے اس گناہ نے الزام پر یقین کر چکے ہیں؟“

”تم نے بات ایک طرف رکھو اور اپنی بتاؤ۔“ وہ بولے۔ ”کیا معافی دینا چاہتے ہو؟“

”دیکھیے بھائی جان۔“ ان کے پوچھنے پر وہ چند لمحوں کے وقفے کے بعد ایک گہری سانس لے کر گویا بڑے بھائی کے رویہ پر مناسب ترین الفاظ کا چناؤ کر کے کہنا شروع ہوا۔ ”بات دراصل کچھ یہ ہوئی کہ۔“

”حد ہوئی ہے کی بات کی۔“ ”میری کی زبانی سہراب والا واقعہ سماعت کر کے یہ وہ سخت برائی سے بولے۔“

”یہ تم دونوں آپس میں کیا سلیم۔ کم کم میل رہے ہو۔ ماں باپ کی عزت ہی کا خیال کر لو۔ میرے بھی میلی براہم ہیں۔ مجھے مت پریشان کرو۔ اور تم نے اب تک یونہی ہی داخلہ کون نہیں لیا؟ کن پکڑوں میں پڑ گئے۔“

”مگر یہ سیاست سے باہر نکلو، کیریز بتاؤ۔ ادھر ادھر دھیان مت دو۔“

”انہوں نے ترشی سے ساری کی ساری اچھی اچھی روایتی نصائح کے دفتر محمول کر فون بند کر دیا تھا۔ تب بھی نے بھی بہت آہستگی سے چونکا دیکھ کر رکھا اور عین اسی لمحے اس نے اچھی طرح یہ جان لیا تھا کہ یہ واقعی صرف اور صرف اس کی جنگ تھی۔ اور اسے اس نے تنہا ہی لڑنا تھا۔“

☆☆☆

”ہائے میں یہاں اس کے لیے میرے تلاش رہ گئی اور وہ وہاں خود سے بڑی کالی بھنگ سے بیاہر چا کر بیٹھ گیا۔“

”شریفہ یہ اطلاع یا کر غش یہ غش کھانے کے بعد اب سر پر ہاتھ رکھے روئے چلی جاتی تھیں۔ یہ کیا ہوا، کیوں ہوا، کیسے ہوا، انہیں تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کی بساط پر اب تک انہوں نے صرف شہی شہی شہی تھی۔ یہ پہلی مات تھی اور ایسی بھرپور بات تھی کہ دل کو کسی طور قرار ہی نہیں پار تھا۔“

”ہائے اسے فون تو کریں۔ پوچھیں تو کسی کہ آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی جو اس کا لے لکے سے ہاتھ سیاہ کر بیٹھا۔“

”وہ اپنے بستر پر لوٹیاں کھاتی ہوئی، سامنے صوفے پر بہت چپ اور خاموش سے بیٹھے شریف احمد سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھیں۔ پر اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں، بلکہ کمرے کے داخلی دروازے کے سامنے، سینے پر ہاتھ باندھے چہرے پر تیس آ میز ڈی سکراہٹ لیے کھڑے مفتاح کے پاس تھا۔ سو وہ بہت چبا چبا کر جاتے لہجے میں بولا۔“

”بہر اتوان سے آپ نے جھین لیا تھا امام بسوا بھائی ان کا مقدر تھا۔“

”دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں آپ۔“ وہ بلبلہ کر شریف احمد کے سامنے فریادی ہوئیں۔ ”بدبخت کیسا تاک تاک کر طر مار رہا ہے مجھے۔ دل پھٹ رہا ہے میرا۔ اسے ذرا احساس نہیں۔“

”آپ کا بیٹا ہوں نا۔“ وہ اداسی سے ہنسا۔ ”مجھے کسی کے دل کا احساس کہاں ہو سکتا ہے۔“

”نکل۔۔۔۔۔۔“ اچانک ہی شریف نے پاس پڑا تکیہ بڑے غصے سے اس کی جانب اچھالا۔ ”دفع ہو جا یہاں سے۔ دو بول دلا سے کے تو بولے نہیں جا رہے بے غیرت سے۔“

”الٹا یہاں کھڑا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا۔“

”نہیں نہیں چمک رہا۔“ وہ باس آگرنے والے نیچے کوٹھڑک مارتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کیا کر چکی ہیں آپ؟“

”کیا؟“ وہ بھر گئیں۔ ”کیا کیا ہے میں نے؟“

”جب آپ کو یہی نہیں بتا کر کیا کیا ہے آپ نے تو بس پھر رہے ہی دیں۔“

”نہیں اب بتانا مجھے۔“ وہ دیرپائی سے بچیں۔ ”بول، کیا کیا ہے میں نے؟ ارے اگر اپنے بچوں کا بھلا چاہا تو کیا غلط کر دیا؟“

”اپنے بچوں کی بھلائی کی خاطر دوسروں کی اولاد کا برا نہیں کرتے مام۔“ وہ بہت معمولی سے لہجے میں بولا تھا۔ شریف آہستہ سے باہر ہو گئیں۔

”اپنی دادی بیگم کی زبان بولتا ہے بے غیرت۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مفتح کو باقاعدہ دھکے دے کر کمرے سے نکالتے ہوئے بولیں۔ ”نکل..... چلا جا یہاں سے..... تو بھی دفع ہو جائیں چاہیے مجھے ایسی بے شرم اولاد جسے ماں ہی کا احساس نہیں۔“

اور مفتح، جس کے پاس انہیں کہنے کے لیے ابھی بہت کچھ تھا، ضبط کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”بھڑا میں جاؤ، مر جاؤ سارے۔“ چھوڑ دو مجھے میرے حال پر، میں تو ہوں ہی بری۔ ہاں ہاں بہت بری۔“ وہ اب وہیں گھڑی زور زور سے چلا رہی تھیں اور ان کی آواز پورے گھر پر عافیت میں گونجی تھی۔

جب کہ شریف احمد وہ اب بھی اسی زاویے سے کم مٹھتے تھے۔

☆☆☆

”اب کسی طبیعت ہے اس کی؟“

وہ آتش کدے میں ان کا فحش بیٹھا رہا، یہاں تک کہ دھوپ دیواروں پر چڑھتے چڑھتے معدوم ہو گئی۔

جب بی۔ ڈی تو نہیں مگر اس کا فون آیا۔ وہ رضیہ کو اسپتال طلب کر رہی تھی کہ کوئی تو ہو جو ”خولہ“ کے ساتھ اسپتال میں رہ سکے کہ اس کے بخار کی تندرست بگڑی صورت حال نے ڈاکٹر کو اسے داخل کر لینے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور بی۔ ڈی خواہ کتنی بھی فعال کیوں نہ ہو، اس کی ہمت اب جواب دے رہی تھی کہ وہ تو خود بڑی حد تک اس پر انحصار کرتی تھی تو اس کی بیمار داری بھلا کیسے کر سکتی تھی۔ سوائے کسی مددگار کی ضرورت تھی۔

لہذا اس نے رضیہ سے اس ضمن میں مدد چاہی۔ وہ تو پہلے ہی یہاں خود پر ”خولہ“ کی بیماری کے سبب پڑ جانے والے لڑکے کاموں کے سبب بھری بیٹھی تھی اور پھر معاملہ بھی اس کا تھا کہ جس سے اسے اب ذاتی پر خاش بلکہ دشمنی ہو چکی تھی سو اس نے تو اپنے بچوں کا بہانا کر کے فوراً سے پیش ترانکار کر دیا اور جھٹ پٹ آتش کدے سے روایتی کی تیاری پکڑ کر جاتے جاتے بیٹھی کو بھی اسی بابت اطلاع دے گئی کہ ان کی واپسی تو اب مشکل ہے چنانچہ وہ اپنی راہ لے۔

اور اپنی راہ لیتا کیا اسی قدر بھل تھا؟

نہیں ہرگز نہیں۔ سو وہ لوگوں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے۔ وہیں سے بی۔ ڈی کو فون کر کے اسپتال کی تفصیلات لینے کے بعد کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔

”وہ ٹھیک نہیں ہے شرب۔“ رونی کو احتیاط کے پیش نظر انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اور وہ دونوں اس وقت وارڈ سے ملحق انتظار گاہ میں آنے سے سانسے موجود تھے۔ بی۔ ڈی کے سوتے ہوئے چہرے پر بے

اندازہ تھا کاٹ اور ”کچھ کھودینے“ کے احساس کا خوف رقم تھا۔

اور وہ پریشان سے لہجے میں جوابا اسے بتا رہی تھی۔

”اس کا پتہ کچھ نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹرز کے مطابق یہ تشویش ناک بات ہے۔ اس کے مختلف ٹیسٹ کیے جا چکے ہیں۔ رپورٹس مل تک آنے کی امید ہے۔ رپورٹس دیکھ کر ہی ڈاکٹر کس طرح سے بتائے گا کہ دراصل اسے ہوا کیا ہے؟“

اور وہ شاید رپورٹس دیکھے بنا بھی اندازہ کر چکا تھا کہ درحقیقت اسے ہوا کیا ہے؟ جب ہی بے گل سے لہجے میں محاسبات کیا۔

”وہ پہلے بھی کبھی اس طرح سے بیمار پڑی ہے؟“

”وہ اس حادثے کے سبب کافی عرصہ بیمار رہی تو ہے۔“ بی۔ ڈی پرسوج سے لہجے میں بولی تو وہ بے طرح چونکا۔

”حادثے کے سبب؟“ اس نے پوچھا۔ ”کون سے حادثے کی بات کر رہی ہو؟“

”کچھ عرصے پہلے کی بات ہے۔“ اسے ”شرز“ پر بھر دیا تھا سو وہ ایک لمحہ توقف کے بعد دیر سے اسے بتانے لگی کہ کتنی حالات میں وہ ایسے ہی تھی اور پھر بعد ازاں کن محرمات کی بنا پر اسے یہیں رکھا گیا اور پھر اب..... اب تو خیر بات ہی دوسری ہو گئی تھی کہ اس کی بے لوث خدمت گزار بی۔ ڈی کے دل میں اس کا ایک علیحدہ مقام بن چکی تھی۔

”کیا تمہیں بھی اس کا ماضی جاننے کا خیال نہیں آیا؟“ وہ چپ ہوئی تو بہت دیر بعد وہ یوں بولا گویا کہیں بہت دور کھڑا خود کو بولتے سن رہا ہو۔

”جچ کہوں تو تمہیں۔“ وہ برملا بولی۔ ”اور پھر اس کا ماضی جان کر مجھے کرنا بھی کیا تھا؟ میری حالت تم دیکھ ہی رہے ہو۔ وہ نیم، وہ اسٹارڈم وہ فنن فالوونگ سب مجھے چھوڑ کر چائیکے۔ بس اب تو یہی میری ساسھی ہے یا پھر تم..... تم میرے ساسھی ہونا شرز؟“

اس کے استفسار میں سوال سے بڑھ کر کوئی احساس تھا۔ جسے وہ فی الوقت سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ تو انڈریئر نمبر چار کی مریض کی جانب لگا تھا۔ تب ہی سادگی سے بولا۔

”ہاں بی۔ ڈی تم ساتھ ہیں۔ اب تم گھر جا کر آرام کرو، میں ہوں یہاں۔“

”اس کا خیال رکھنا شرز.....“ وہ جانتا نہیں چاہتی تھی مگر جانے پر مجبور تھی سو اسے بولی۔ ”یہ ساری ساری رات سجدے میں گری روٹی دیتی تھی۔ کوئی تم لگا ہے اسے..... مجھے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ شاید کچھ کہ سن لینے سے اس کا دل ہلکا ہو جاتا اور آج وہ یوں بے حال نہ پڑی ہوئی۔ خیر اب جب وہ فائیس گھر آئے گی تو میں اس سے ضرور پوچھوں گی۔“

ایک ارادہ وہ کر رہی تھی اور ایک تقدیر.....

اور یہ بتانے کی حاجت تو نہیں کہ کس کا ارادہ پورا ہونا تھا!!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆